R. No. 9??57 — Regd. No. 932

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت ۲۹-۸-۶۳

ٹیلی فون ۔ ۲۹
قیمت تین روپے سالانہ
فی پرچہ دس نئے پیسے

جلد ۲۲ ۔ شمارہ ۳۳	ایڈیٹر ۔ آل احمد سرور	یکم ستمبر ۱۹۶۳ء

اداریہ

سائنسی انقلاب کا ادب پر اثر

سی پی اسنو نے کہا ہے کہ دنیا اب سائنسی انقلاب کے دور سے گزر رہی ہے۔ یورپ، امریکہ اور روس میں یہ انقلاب نظامِ زندگی کو بدل چکا ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں اس کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق اس انقلاب سے دو تہذیبوں، سائنسی تہذیب اور پرانی ادبی تہذیب میں بڑا بُعد پیدا ہو گیا ہے اور ایک گروہ کے افراد دوسرے گروہ کے افراد کی بات نہیں سمجھتے۔ اس کا ... یہ ہے کہ سائنسی تہذیب مستقبل کی تہذیب ہے اور پرانی ادبی تہذیب اب روز بروز اس کے مقابلے میں شکست کھاتی جا رہی ہے۔

اگرچہ اسنو کی بات میں کچھ مبالغہ ضرور ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ سائنس کی ترقی اور ٹیکنالوجی کے فروغ نے ایک نئے مزاج کو جنم دیا ہے اور یہ مزاج روز بروز زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی مخالفت بے سود ہے اور اس کو برا بھلا کہنے سے کام نہیں چلے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے ساتھ ساتھ ایسی پرانی ادبی قدریں بھی باقی رہ سکتی ہیں جنھوں نے اب تک انسان کی روح کو تسکین دی ہے اور جو حسن، سچائی اور نیکی کی طرف گامزن کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ایسا ممکن ہے۔

سائنس کو سرتاسر لعنت سمجھنا خام خیالی ہے۔ سائنس لعنت نہیں، جس طرح علم لعنت نہیں۔ ہاں علم جس طرح سانپ ہو سکتا ہے اسی طرح سائنس بھی زہر کا کام کر سکتی ہے۔ اسی علم سے اچھے کام بھی لئے جا سکتے ہیں اور لئے جاتے رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی بھی اسی طرح انسان کے لئے رحمت ہو سکتی ہے۔ سورج کی شعاعوں کا گرفتار کرنے والا، زندگی کی شبِ تاریک کو بھی سحر کر سکتا ہے۔

مگر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ صحیح معنی میں سائنسی اور معروضی نظر پیدا کی جائے۔ معروضی نظر کے معنی یہ ہیں کہ ان طاقتوں کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا جائے جو تجربے کے پیمانے میں نہیں سما سکتیں مگر جن کے پیچھے جذبے یا عقیدے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ سائنسی نظر پرانی چیزوں کو اس وجہ سے رد نہیں کرتی کہ وہ پرانی ہیں، وہ نئی چیزوں کو اس وجہ سے گلے نہیں لگاتی کہ وہ نئی ہیں، وہ ان چیزوں کی اہمیت، معنویت، قدر و قیمت دیکھتی ہے اور اس کوشش میں رہتی ہے کہ اس سے مناسب کام لے۔

اگر یہ بات واضح ہے تو پھر انسانیت کا سب سے بڑا کام آج یہ ہے کہ ہر فرد کو بلا لحاظ مذہب و ملت، جنس، رنگ و نسل، انسان کی حاصل کی ہوئی قوت سے فائدہ پہنچے۔ اُسے غذا ملے، اس کی تعلیم ہو، اس کی صحت کا انتظام ہو۔ وہ اچھا سماج بنا سکے۔ بڑی حد تک اُسے اپنی صلاحیت کے مطابق اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کا موقع ہو اور پھر اس فرد سے ایسا کام لیا جائے کہ اس کی صلاحیت اُس کے سماج کے لئے اور انسانیت کے لئے باعثِ خیر ہو۔

اس اشاعت میں

اس سلسلے میں اُن قوموں کا جو اس میدان میں آگے ہیں یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نسبتاً پس ماندہ اقوام کے معیار زندگی کے بڑھنے میں مدد دیں، یہ مدد ایک سیاسی مصلحت سمجھ کر نہیں، ایک اخلاقی فریضہ سمجھ کر دی جائے۔ اسے مُفت کی دولت سمجھ کر نہیں، بلکہ قرض حسنہ سمجھ کر قبول کیا جائے اور اس سے صحیح کام لیا جائے، اسے برباد نہ کیا جائے۔

پھر ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ سبھی قوموں کا یہ بھی فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کریں جس میں فلاح کے یہ کام جاری رہ سکیں اور جنگ کا خطرہ جو آسیب کی طرح اس دور کے انسان پر منڈلاتا رہتا ہے۔ دور ہو سکے۔

عام لوگوں میں اپنی زندگی کی سختیوں اور کشاکش روزگار کی وجہ سے انسانیت کے اس مشن کا احساس نہیں ہوتا، اس لئے ادب کے ذریعے سے اس مشن کو مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ ادب سائنس کی ہم نوائی کر کے، سائنسی انقلاب کو رحمت بنا سکتا ہے۔ سائنس ادب کی مدد سے انسانیت کو اور بلندی تک لے جاسکتی ہے اور اُسے تعصب، تنگ نظری اور پرانی رنجشوں اور لغزشوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے اس لئے ہمیں ادب کی خاطر اور سائنسی بننا ہے اور سائنس کی خاطر ادب کی حیات بخش اور روح پرور قدروں سے کام لینا ہے۔ یہ کام نئی فکر اور نیا فن چاہتا ہے، لکیر کا فقیر بننے سے کچھ نہ ہو گا۔

ہندوستان صنعتی دور میں قدم رکھ چکا۔ وہ سائنس کو گلے سے لگا رہا ہے۔ اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ سائنسی انقلاب میں ادب سے مدد لے اور ادب کی اعلیٰ قدروں کو اپنائے اُردو دوستوں کو بھی یہ سائنسی نظر پیدا کرنی ہے تاکہ وہ مایوسی اور پست ہمتی سے نکل سکیں اور مستقبل کے وسیع امکانات میں اپنی جگہ پا سکیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو اُن کا رول ہر تغیر پہ ماتم کرنے والوں کا ہو جائے گا۔ یہ ماتم کا نہیں مستی کردار کا وقت ہے۔

سیر بین

آج کل علی گڑھ میں بہت چوریاں ہو رہی ہیں۔ یہ چوریاں سول لائن اور یونی ورسٹی کے علاقے میں زیادہ ہوئی ہیں۔ ایک صاحب کے یہاں چوری ہوئی۔ وہ یونی ورسٹی کے بہت بڑے افسر ہیں۔ چوروں نے سمجھا ہو گا کہ بڑا ہاتھ ماریں گے، مگر اُنھیں صرف ایک بکس میں سو روپے اور ایک گھڑی ملی۔ ایک پلنگ پر تین اچھے کمبل نظر آئے۔ انھوں نے سوچا کہ چلو یہ کمبل ہی لیتے چلیں۔ کمبل کو بستر کی طرح لپیٹ کر اور بغل میں داب کر جب یہ لوگ نکلے تو شامت اعمال سے پولیس کی ایک پارٹی سڑک پر گشت کرتی ہوئی مل گئی۔ تین آدمی تھے۔ تینوں بھاگے۔ دو نکل گئے۔ ایک پکڑا گیا جو بقول ان افسر کے صورت سے انگریزی میں ایم۔ اے معلوم ہوتا تھا۔

ایک دوسری جگہ چور پہنچے تو انھوں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، صرف ایک بندوق اور ایک قفل لے گئے۔ تیسری جگہ پہنچے تھے کہ صاحب خانہ جاگ گئے۔ چوروں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک لاٹھی ان کے رسید کی۔ اب وہ صاحب تو اسپتال میں ہیں، چور اب تک ہاتھ نہیں آئے۔

آپ کہیں گے کہ ایسے میں پولیس کیا کر رہی ہے؟ بھائی پولیس بھی کیا کرے۔ اُس کا کام کتنا بڑھ گیا ہے۔ کوئی بڑا آدمی آتا ہے تو اُس کی جائے قیام پہ پہرہ لگ جاتا ہے سڑکوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سپاہی کھڑا ہوتا ہے افسران بڑے آدمی کی اردلی میں رہتے ہیں۔ سپاہی پہرہ دیتے ہیں۔ پھر کوئی ایک کام ہو تو پولیس کرے۔ آج یہاں چوری ہو گئی۔ کل وہاں ڈاکہ پڑ گیا۔ پرسوں اُس سڑک پہ ہنگامہ ہو گیا۔ اترسوں اُس میلے میں ڈیوٹی لگ گئی۔ غرض بقول اقبال ع

> ہزار کام ہیں مردان حُر کو دنیا میں
> وہ ہر گھر کی چوری کا سُراغ کہاں تک لگائیں۔

برسات میں ویسے ہی بارش، مچھر، اُمس کیا کم تھے کہ ان چوریوں نے بھلے آدمیوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کل اسٹاف کلب میں چھ مرکزی وزیروں اور چھ ریاستوں کے بڑے وزیروں کے استعفے پر کوئی تنقید نہیں ہو رہی تھی، سب چوروں کے کارنامے بیان کر رہے تھے۔ غضب خدا کا اب نہ کوئی ڈاکٹر وارڈ کی خودکشی پر تبصرہ کرتا ہے، نہ مس کیلر کے ہوش رُبا حُسن کا، نہ شکر کی کمی کا، نہ پروفیسر حبیب کے اس توسیعی لیکچر کا جو ایک ہی گھنٹے کے اندر ختم ہو گیا، نہ جانے والے وزیروں کی جانشینی کے متعلق قیاس آرائی کرتا ہے، ہر نئی واردات پر روشنی ڈالتا ہے اور دل میں سوچتا جاتا ہے ؎

> چور تے کس کو دستگاری ہے　　آج وہ کل ہماری باری ہے

اُردو کتابوں پر انعام

مرکزی وزارت تعلیم ہر سال منظورہ چودہ زبانوں میں کم لکھے پڑھے لوگوں کے لئے لکھی ہوئی کتابوں پر پانچسو روپے انعام دیتی ہے اس سال اُردو کی ان دو کتابوں کو انعام ملا ہے۔

(۱) مس وارث راشد قدوائی کی کتاب "سائنس بابا"

(۲) مس عبدالرشید کی کتاب "ایٹم کی کہانی"

نظر حیدر آبادی

گزشتہ سے پیوستہ

حیدرآباد سے جوش صاحب کی

علیٰحدگی کے حقیقی اسباب

اس کہانی کو پڑھنے کے بعد اس کے تیسرے کردار کے بارے میں جو تاثر قاری کے ذہن میں قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تیسرے درجے کا شاعر جوش صاحب کے مقابل ہونے کے لئے جوش و نیاز صاحبان کو "استعمال" کرتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے، چنانچہ نیاز صاحب نے "نگار" میں "جوش اور علی اختر کی شاعری کا تقابل کر کے علی اختر کو جوش کے مقابلے میں خوب بڑھایا چڑھایا"۔

اس قضیئے کے بارے میں خود جوش صاحب کیا فرماتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔ ماہ نامہ "افکار" کراچی کے جوش نمبر کے دوسرے ایڈیشن میں جناب شاہد احمد دہلوی کے مضمون کا جواب دیتے ہوئے "علی اختر اور یہ خادم" کے عنوان سے وہ لکھتے ہیں:

"میرے محبوب و معصوم دوست حضرت سید علی اختر صاحب مرحوم کے مابین ایک وقتی شکر رنجی کی جو صورت ایک دوست کی مخلصانہ لیکن خطرناک مزاج نے پیدا کر دی تھی۔"

اس کے بارے میں شاہد صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"جوش صاحب اور علی اختر مرحوم کا کسی بات پر اختلاف ہوا... کوئی بہت بڑی بے ہودہ بات ہو گی جو جوش صاحب کی طرف سے جو علی اختر جیسے سادھو قسم کے آدمی کو ناگوار گزری۔"

"بڑی حیرت ناک بات ہے کہ شاہد صاحب کو ہماری "علتِ اختلاف" کی نہ پہلے خبر تھی نہ آج ہے۔ نہ انھیں اس اختلاف کی ابتدا ہی کا کوئی پتہ ہے، نہ انتہا کا اور نہ انھیں اس کا ہی کوئی علم ہے کہ وہ اختلاف شروع ہوا تھا کس جانب سے۔"

اختلاف کی شروعات کی توضیح اور اس کی "جانب" کی نشاندہی بھی جوش صاحب فرما دیتے تو مناسب تھا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ پتہ نہیں کیوں؟ اُن کے "محبوب و معصوم" دوست کے "مابین ایک وقتی شکر رنجی" کو چونکہ خود جوش صاحب کے حلقہ بگوشوں اور "بوتل برداروں" نے بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے اس لئے اس کی وضاحت ضروری تھی۔ اس قضیئہ نامرضیہ کے بارے میں جو کچھ میں جانتا ہوں اُسے میں نے "نگار" کے نیاز نمبر (حصہ دوم) میں لکھ دیا ہے۔ یہاں اس کا نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

جناب نیاز کے "نگار" کو ایک دبستان کی حیثیت حاصل ہے۔ "نگار" نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا ہے، ان متعارف ہونے والے لوگوں میں حیدر آباد کے نامور اصحاب کی بڑی تعداد شامل ہے۔ جن میں سے چند کا تذکرہ اسی موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان اصحاب میں سر فہرست میرے والد بزرگوار حضرت علی اختر مرحوم کا اسم گرامی ہے۔

حضرت علی اختر طبعاً نہایت خاموش اور عزلت پسند انسان تھے، محفلوں اور مشاعروں کی ہنگامہ آرائی سے انھیں وحشت ہوتی تھی اور اپنے خاص احباب ہی کو اپنا کلام سُناتے تھے اور اشاعت کے لئے بھیجنا تو اُن کے بس کا روگ ہی نہ تھا۔

حیدر آباد میں شائع ہونے والے رسائل "تاج" "مکتبہ" "شہاب" وغیرہ میں ان کا کلام کبھی کبھی چھپ جاتا تھا وہ بھی اس طرح کہ ان رسائل کے مدیران زبردستی اُن سے اُچک لیتے تھے۔

جناب ہوش بلگرامی والد صاحب کے شفیق ترین احباب میں سے تھے، اور ان کے کلام کے بڑے قدر دان، چنانچہ انھیں کے توسط سے جناب نیاز سے ان کا تعارف ہوا اور نیاز صاحب بھی اس عزلت نشین شاعر کے قدردان ہو گئے اور ان کی نظموں کو بڑے اہتمام سے "نگار" میں شائع کرنے لگے۔ "نگار" میں ان کے کلام کا شائع ہونا تھا کہ اس نئی آواز نے ساری ادبی دنیا میں ایک دھوم سی مچا دی اور تھوڑے ہی عرصے میں حیدر آباد کا ایک گوشہ گیر گمنام شاعر ہندوستان گیر شہرت کا مالک بن بیٹھا، اور اس کا شمار جدید شعراء کی صفِ اوّل میں کیا جانے لگا، اور اس وقت کے تقریباً تمام موقر جرائد میں ان کا کلام شائع ہونے لگا۔ اس زمانے میں جوش صاحب کا قیام بھی حیدر آباد ہی میں تھا، اور یہ وہ زمانہ ہے جب ایک نظم نگار کی حیثیت سے جوش صاحب کی شہرت کا آفتاب بھی نصف النہار پر تھا۔ اگرچہ جوش صاحب والد مرحوم کے خاص احباب میں سے تھے اور اُن کے بڑے قدردان بھی، لیکن اس نئی صورت حال نے جوش صاحب کے اندازِ راہ و رسم میں ایک خاموش لیکن غیر متوقع تبدیلی سی پیدا کر دی۔ حیدر آباد کے ادبی حلقے دو گروہوں میں بٹ گئے اگرچہ بڑا حلقہ جوش صاحب ہی کا تھا۔ کیونکہ حیدر آباد میں وہ ایک قابل لحاظ عہدے پر بھی فائز تھے اور حیدر آباد میں اس بات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔

بات بڑھتی گئی، پھر سُنانے والوں نے سنایا کہ جوش صاحب اپنی نجی محفلوں میں خصوصاً "عالم سرخوشی" میں اکثر کہا کرتے ہیں کہ "اختر تو میری نظموں کے چربے اتارا کرتے ہیں"۔ اس بات نے والد صاحب جیسے درویش صفت انسان کو بھی بلا کر رکھ دیا۔ انھوں نے ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا "جواب"

یہ میرا فیض ہے گُن گا رہا ہے اک جہاں تیرا
کہاں میں اور کہاں طفلانہ اندو بیاں تیرا

"اندازِ راہ و رسم" کے بدلنے کی جو وجہ میں نے لکھی ہے اُس کی تصدیق حیدرآباد کے ایک غیر ذمہ دار ادیب اور جوش صاحب کے احسان مند ارادت کیش تمکین کاظمی مرحوم (احسان مند میں نے اس لئے لکھا ہے کہ جب جوش صاحب ہندوستان میں تھے تو انھیں کی سفارش پر حکومت نے تمکین مرحوم کو ادبی وظیفہ دینا منظور کر لیا تھا) کے اس مضمون سے بھی ہوتی ہے جو "افکار" کے جوش نمبر میں شایع ہوا ہے۔ مضمون نگار نے اپنے ممدوح کے میلانِ طبع کو دیکھتے ہوئے لکھا ہے:

"جوش کے ایک دوست تھے جو شاعر بھی تھے۔ روزانہ شام میں جوش ان کے گھر پہنچتے اور اپنی تازہ نظم سناتے تھے۔ یہ بزرگ اس نظم کو سُن کر راتوں رات اس مفہوم کو اپنی زبان میں نظم کر لیتے اور صبح لکھ کر کسی رسالے کو بھجوا دیتے۔ اور جوش نظم لکھنے کے بعد گھر میں رکھ دیتے۔ اگر کوئی شخص اسے نقل کر کے کسی رسالے کو بھجوا دیتا تو طبع ہو جاتی ورنہ پڑی رہتی۔ مگر ان شاعر صاحب کی نظم فوراً طبع ہو جاتی۔ اور جب جوش کی نظم طبع ہوتی تو یہ بہ کمال معصومیت لوگوں کو بتاتے کہ دیکھئے صاحب میری یہ نظم آج سے چار ماہ پہلے فلاں رسالے میں طبع ہو چکی ہے۔ اب جوش نے میری نظم کو دیکھ کر نظم کہی اور چھپوائی ہے۔ دیکھنے والے دیکھتے اور قائل ہو جاتے کہ اصلی حال کسی کو معلوم ہی نہ تھا۔ چنانچہ اسی چکر میں نیاز فتحپوری بھی پھنسے۔" تمکین مرحوم میں اتنی اخلاقی جرأت تو تھی نہیں کہ وہ جوش صاحب کے "شاعر دوست" کا نام بھی ظاہر کر دیتے لیکن "اسی چکر میں نیاز فتحپوری بھی پھنسے" لکھ کر انھوں نے اپنے تیروں کے نشانے کی سمت نمایاں کر دی۔ جیسے زنانہ ہے یہ باتیں انھوں نے جوش صاحب سے ہی سُنی ہوں گی جن میں اکثر والد صاحب کے اس دعوے "میرا فیض ہے حسن کا رہا ہے اک جہاں تیرا" کی دلیل کے بارے میں متلاشی رہتا تھا۔ اب تمکین کی مدح سرائی نے وہ دلیل فراہم کر دی۔

جوش صاحب کے تیسرے مجموعۂ نظم "شعلہ و شبنم" مطبوعہ ۱۹۳۶ء میں صفحہ ۱۷۹ پر اُن کی ایک غزل ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:

باقرؔ نے لکھوائی مجھ سے طرح دے کر یہ غزل
جوش شیدائی انھیں ہے، مجھ سا شیدائی مجھے

باقرؔ سے حسبِ تعارف جوش صاحب نے فٹ نوٹ میں اس طرح کرایا ہے:

"سید کاظم علی صاحب باقرؔ جو میرے ہونہار دوست حضرت اختر کے والد ہیں۔" "ہونہار" کا لفظ ایک ایسے "محبوب و معصوم" دوست کے متعلق استعمال کیا گیا ہے جو عمر میں ان سے دو سال بڑا تھا۔ (حضرت علی اختر کا سن پیدائش ۱۸۹۴ء ہے اور جوش صاحب کا ۱۸۹۶ء)

معلوم نہیں یہ "پیش بندی" کس لئے کی گئی! شاید اس لئے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جیسے عالم نے (جو اس زمانے میں مذہبیات کے علاوہ ادب و صحافت سے بھی گہرا ربط رکھتے تھے) حضرت اختر کی نظم "منکرانِ خدا سے خطاب" مطبوعہ ۱۹۳۱ء کے دیباچے میں لکھا تھا "میرا دوسرا کام یہ ہونا چاہئے تھا کہ نظم کی زبان و اندازِ بیان پر شاعرانہ نقطۂ نظر سے تبصرہ کرتا، مگر میں اس سے معافی چاہتا ہوں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ دوستانہ جنبہ داری سے احتراز کی کوشش میں شاید میں اپنے دوست سے انصاف نہ کر سکوں گا، تاہم میں کسی خوف کے بغیر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ علی اختر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو خیال کی نزاکت، فکر کی گہرائی، نظر کی وسعت، اور بیان کی بلاغت کے اعتبار سے ہندوستان کے جدید شعراء کی صفِ اول میں کھڑے ہونے کے قابل ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی بے نیازی اپنے جوہر کی تشہیر پسند کرتی ہے اور نہ ان کی قوم میں اب وہ جوہر شناسی باقی ہے کہ اُن کے کمال کی از خود قدر کرے۔"

جوش صاحب کے ترکِ حیدرآباد کے بعد "چہرے اُتارنے والی بات" کے بھی شمالی ہند میں بہت چرچے ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں "حضرت اختر" کا پہلا مجموعۂ نظم "اسرار" شایع ہوا تو ان آوازوں کی گونج پنجاب کے ادبی حلقوں میں بھی سُنی گئی۔ پنجاب کے مشہور شاعر اور نقاد مختار صدیقی نے حلقۂ اربابِ ذوق میں "اسرار" پر ایک مضمون پڑھا تھا جس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔ "یہ فیصلہ کرنا کہ جوش اور علی اختر میں سے کس نے کس کو اس درجہ متاثر کیا؟ ہمارا کام نہیں۔ علی اختر حیدرآبادی ہیں، جوش کی شعری زندگی کا بہترین حصہ بھی حیدرآباد یا اُس سے فوراً بعد کے زمانے کی پیداوار ہے، عام لوگوں کی رائے یہی ہے کہ جوش کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور ایک خاص طرزِ ادا نے جس طرح ہزاروں نوجوانوں کو متاثر کیا اور ان کے اسلوب، انتخابِ الفاظ، موضوع اور طرزِ تفکر پر گہرا اثر چھوڑا ہے اسی طرح علی اختر کو بھی اس درجہ اپنا پابند نے کیا کہ وہ ان کے راستے پر دوسروں سے زیادہ کامیابی سے گامزن ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ درست ہو لیکن میں اس سلسلے میں صرف دو باتیں کہوں گا۔ آخری فیصلہ آپ لوگوں پر ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علی اختر اگر جوش سے متاثر ہوئے بھی تو صرف اندازِ بیان اور انتخابِ الفاظ تک کیوں رہے، جوش کا شاعرانہ کمال... اس وقت اوج پر ہوتا ہے جو بقول ڈاکٹر عبدالحق صاحب مئے دیرینہ اور معشوقِ جوان کی تعریف میں قصیدے لکھتا ہے، اُس کا نعرۂ انقلاب فنی اور نظریاتی لحاظ سے ان قصیدوں سے کہیں پست ہے حقیقی جوش سے آپ کی ملاقات "جرسِ دررقص" "کوہستانِ دکن کی عورتیں"۔

(باقی صفحہ ۸ پر)

جگن ناتھ آزاد

آسام میں جشنِ اُردو

(نظم ۱۷ اگست کو گوہاٹی کے مشاعرے میں پڑھی گئی)

آئیے اپنی زباں کی شان ہر سو دیکھئے
آج گوہاٹی میں آ کر جشنِ اُردو دیکھئے

جس سے ہیں مہکے ہوئے پنجاب یوپی اور دکن
آئی ہے آسام تک اُس گل کی خوشبو دیکھئے

مجھ کو ہوتا ہے گماں جس پر عظیم آباد کا
نقشِ گوہاٹی کا وہ نایاب پہلو دیکھئے

آج پروا اور فخر الدین احمد کے طفیل
نام کو باقی نہیں فرقِ من و تو دیکھئے

یہ بھی تیرا اک کرشمہ ہے کرشموں کی زمیں
ذرّے ذرّے سے نمایاں عشقِ اُردو دیکھئے

یہ زباں جادو ہے اور آسام ہے جادو کا دیس
بولتا ہے کس طرح سر چڑھ کے جادو دیکھئے

زود گوئی امرِ ناممکن رہا جس کے لئے
اُس کے اندازِ بیاں کا یہ بھی پہلو دیکھئے

غزلیں

چندر پرکاش شاد

ذہنوں کا وبال ہو گئے ہم
اُلجھا ہوا جال ہو گئے ہم

بکھرے تو نمودِ شوق بن کر
سمٹے تو سوال ہو گئے ہم

مایوس ہوئے تو کس ادا سے
تصویرِ خیال ہو گئے ہم

اے وقت کی گردشو کو بھی
گردِ مہ و سال ہو گئے ہم

اک کھیل ہے مرگ و زیست جس میں
بے کار سی چال ہو گئے ہم

حافظ عبد الرشید رشید گلبرگوی

کہیں شاخِ گل پر خبردار بلبل! نشیمن بنانے کی کوشش نہ کرنا
جہاں بجلیوں کی نظر پڑ رہی ہو وہاں سر چھپانے کی کوشش نہ کرنا

جو بھر آئے دل تیرا ضبطِ فغاں کر کسی طرح ظاہر نہ سوزِ نہاں کر
کبھی سامنے اُن کے اے چشمِ پُرنم تو آنسو بہانے کی کوشش نہ کرنا

تڑپتے ہی گزری شبِ ہجر میری، لگی ہے بوقتِ سحر آنکھ تھوڑی
دلِ غمزدہ بس ابھی سو گیا ہے، اسے پھر جگانے کی کوشش نہ کرنا

تماشا نہیں جلوۂ روئے یوسف، تماشا نہیں صنعتِ حسنِ یوسف
نظر لگ نہ جائے مرے ماہ رو کو، تماشا بنانے کی کوشش نہ کرنا

رشید ایسا جس کا دل سوختہ ہے، محبت کا سرمایہ اندوختہ ہے
زمانہ جسے آزمایا ہو برسوں، اُسے آزمانے کی کوشش نہ کرنا

حبیب احمد صدیقی

منزل پہ میں پہنچ کے بھی منزل سے دور تھا

ہر چند ہوش کھونے میں دل کا قصور تھا
کچھ اس نگاہ کا بھی تصرف ضرور تھا

سینے میں جب ہمارے دلِ ناصبور تھا
پھولوں میں تازگی تھی ستاروں میں نور تھا

پچھتا رہے ہیں جب سے ہیں ساقی اُٹھا کے ہم
ملتا نہیں جو تشنہ لبی میں سرور تھا

اُتنی ہی اُس کو وسعتِ فکر و نظر ملی
دنیا میں جس کو جینے کا جتنا شعور تھا

کچھ تشنگیٔ ذوقِ عمل اور بڑھ گئی
منزل پہ میں پہنچ کے بھی منزل سے دور تھا

گزرا ہے فرطِ شوق میں وہ وقت بھی کہ جب
آنکھوں میں نور قلب میں شورِ نشور تھا

رہنے گئے تھے اپنی تباہی کا ہم گلہ
معلوم یہ ہوا کہ ہمارا قصور تھا

منظور تھا نہ پاسِ محبت اگر تمہیں
کچھ پاسِ رسم و راہ تو کرنا ضرور تھا

کیوں خانماں خراب نہ ہوتا ہمارا دل
نادان تھا خود فریب تھا اُس پر غیور تھا

جو زندگی کو بخش گیا تابشِ دوام
لے دے کے خود وہ محبت کا نور تھا

ساقی کے اذنِ عام کے جو منتظر ہے
ہیں جن کے واسطے درِ میخانہ دور تھا

دینے کو درس سعی و عمل جہدِ زیست میں
محرومیوں کا دور بھی آنا ضرور تھا

ملک اسمٰعیل حسن خاں

مرنے کے بعد بھی نہ تری آرزو گئی
وہ کون سی خلش تھی جو یوں دل کو چھو گئی

وہ کیف جانفزا ہے بہاروں کے فیض سے
ہر موجۂ نسیم بھی کچھ سرخرو گئی

یوں بھی تو ہیں بہار میں یہ لالہ کاریاں
رگ رگ سے میری لے کے وہ کتنا لہو گئی

ٹھکرا کے بڑھ گیا کبھی دیر و حرم سے بھی
کن منزلوں پہ لے کے تری جستجو گئی

تقدیر نے وہ رنگ دکھایا ہے اے ملک
وہ ولولے، وہ جوش، وہ فکرِ سبو گئی

نازش انصاری

لطف جب ہے کوئی تڑپ اُٹھے
ورنہ آہ و فغاں سے کیا حاصل

زندگی ہی سے جب سکوں نہ ملا
موت سے پھر امید لا حاصل

ان سے آگے بھی مجھ کو جانا ہے
چاند تارے نہیں مری منزل

کتنا دلکش ہے پیار کا طوفاں
کاش پاؤں نہ عمر بھر ساحل

ایم۔ اے عرشی انصاری

جب دل پہ تری یاد کے طوفاں نہیں گزرے
وہ زیست کے لمحے کبھی آساں نہیں گزرے

کس بزم کی رونق نہ ہوئی اہلِ جنوں سے
کس راہ سے دیوانے غزل خواں نہیں گزرے

کون ان میں ترا چاہنے والا نہیں گزرا
کافر نہیں گزرے کہ مسلماں نہیں گزرے

مراسلات

اُردو — کلاسیکی زبان

آپ کا اداریہ مورخہ ۸ راگست "چوٹی کی بات" نظر سے گزرا۔ زبان اُردو کو کلاسیکل کہنے والوں کو سوائے اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ ان کی واقفیت اور علم کا دائرہ نہایت محدود بلکہ بالکل تنگ ہے۔ ان لوگوں کو خود اپنی تہذیب اور کلچر سے اس قدر نفرت ہوگی اس کا قیاس بھی ممکن نہ تھا۔ اللہ! جان گلکرائسٹ اور میر امن اور ان کے شرکار کی مغفرت فرمائے اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی تروبجی اور اشاعتی محنت بالکل اکارت ہوجانے والی ہے۔ اچھا ہوتا کہ یہ حضرات زبان اُردو کو نہ سنوارتے! بناتے تو۔ اُردو کو کلاسیکی اور موجودہ زمانے کی ناموافق زبان کہنا کتنی بڑی نادانی ہے۔ آخر اس کے عروج کا زمانہ کب رہا ہے؟ اور کہاں؟ کم از کم ہندوستان میں تو اُردو کبھی سلطنتی زبان نہیں ہوئی۔ پتہ نہیں یہ اُردو دشمن حضرات دامن جھاڑ کر صرف اُردو ہی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟ بچارے یو۔پی کے وزیر اعلیٰ شری سی، بی گپتا بھی ہندی، ہندی، ہندی کی تکرار سے عاجز آکر بول گئے "تمہاری ہندی سے تو ہم پریشان ہوگئے" ایک طرف تو جا وبے جا ہندی کی ٹھونس ٹھانس ہے، دوسری طرف اُردو سے دیدہ و دانستہ حکومت اور اس کے ذمہ داران غفلت برت رہے ہیں۔ "آبشار" نے اپنے اداریے "اُردو اور فلم ڈویژن" کے عنوان سے جس مسئلے کی نشاندہی کی ہے وہ بھی معمولی بات نہیں شاذ ہی اُردو کی کسی فلم کی نمائش جموں و کشمیر کے علاوہ دوسری جگہوں پر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اُردو کی تعلیم اور ریڈیو پروگراموں میں اُردو کے پروگرام کا مسئلہ الگ ہے۔ حال ہی میں تو نعام اللہ انصاری جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے ٹی، این، ڈگری کالج باندہ میں اُردو کے خاتمے کی خبر دی ہے۔ بہار میں پانچ یونیورسٹیاں ہیں جن میں محض پٹنہ یونی ورسٹی میں ایم، اے اُردو کی تعلیم منظور کی گئی ہے۔ رانچی، گیا، مظفر پور اور بھاگل پور یونیورسٹیوں میں اور زبانوں کی تعلیم تو ہے لیکن اُردو کی نہیں۔ گیا اور مظفر پور کے وائس چانسلر ہرسال وعدہ فرماتے ہیں اور پھر وعدہ خلافی کے جواز میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اُردو پڑھ کر کیا کروگے" جہاں تک ریڈیو پروگراموں کا تعلق ہے اس کا بھی وہی حال ہے۔ پتہ نہیں ہماری حکومت، اقلیت کا تحفظ عملی طور پر کب سے شروع کرے گی۔ ممکن ہے کوئی پنج سالہ پلان اس کے لئے بھی منظور کیا جائے۔

(قمر اعظم ہاشمی)

بے سلطنت قوم یا جسم بے روح

ہے قوم جسم سلطنت اس میں ہے مثل روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے
سمجھی شغال دگرگ سے جنبش ہوئی اگر
نافہم سمجھے قوم میں خود انتعاش ہے
البتہ زندگانی شخصی کا ہے وجود
قانون میں ہر اک کے لئے زندہ باش ہے
پیمانہائے ساختۂ شاہ وقت پر
محدود طالبین کی فکر معاش ہے
بے علم مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست
اس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے
کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جذب غیر
یہ مسئلہ صحیح ہے گو دل خراش ہے
اکبر یہ احتیاط کہ بوسہ پہ اکتفا
اس پہ بھی یہ عتاب کہ تو بد معاش ہے

جب اپریل ۱۹۵۹ء میں میری مرتب کردہ کتاب "تبرکات اقبال" شائع ہوئی تو لاہور کے سہ ماہی رسالہ "اقبال" نے اکتوبر ۱۹۵۹ء کے پرچے میں حسب ذیل ریویو کیا۔

"...... اس کے علاوہ "تبرکات" میں بعض منظومات کی حیثیت بے حد مشتبہ ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ ۳۶ پر جو نظم "بے سلطنت قوم یا جسم بے روح" کے عنوان سے درج ہوئی ہے وہ ہرگز علامہ اقبال کی نہیں بلکہ اکبر الٰہ آبادی کی ہے جو رسالہ زمانہ کانپور (جولائی ۱۹۲۰ء) میں شائع ہوئی تھی اور جس کے دو تین اشعار ذیل ہیں۔

ہے قوم جسم سلطنت اس میں ہے مثل روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے

بزم اکبر کراچی نے تو کلیات اکبر بڑے اہتمام سے شائع کی ہے اس کے حصہ اول کے صفحہ ۲۰۳ پر یہ قطعہ درج ہے اور یہ مزید ثبوت اس امر کا ہے کہ یہ اشعار علامہ اقبال کے نہیں ہیں۔"

جب مجھے اس ریویو کی خبر ہوئی تو اس وقت رسالہ زمانہ بابت جولائی ۱۹۲۰ء میرے سامنے موجود نہیں تھا اور میں نے ریویو نگار کے اعتراض کو تسلیم کرلیا مگر حال ہی میں نوادر اقبال مرتبہ عبد الغفار شکیل صاحب کا ایک نسخہ حاصل کرنے پر معلوم ہوا کہ شکیل صاحب نے بھی نوادر اقبال (ص ۲۵۸) میں اس کو اقبال ہی کا کلام سمجھ کر اپنی کتاب میں رسالہ سخن سنج لکھنؤ ماہ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے حوالے سے درج فرمایا ہے۔ میں نے پھر تحقیقات سے کام لیا تو رسالہ زمانہ کانپور

بابت جولائی ۱۹۲۰ء میں اس قطعہ کو اقبال ہی کے نام سے محفوظ پایا۔ (ص ۵۸)۔ رسالۂ اقبال کے ریویو نگار کا یہ بیان کہ رسالہ زمانہ میں یہ قطعہ اکبر الہ آبادی کے نام سے درج ہے سراسر غلط اور غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قطعہ حضرت اکبر الہ آبادی کا ہے اور کلیات اکبر حصہ اول میں درج ہے۔ (کلیات اکبر حصہ اول شائع کردہ سنٹرل بکڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی ص ۱۹۰ سلسلہ وار نمبر ۲۳۰) رسالہ زمانہ اور سخن سنج کے ایڈیٹروں سے نادانستگی میں غلطی ہوئی ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف میں نے ۲۲ر فروری اور ۸ر مارچ سنہ ۱۹۶۰ء کے "ہماری زبان" میں چھپوا دیا تھا۔ مگر مرتب "نوادر اقبال" نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اور کتاب نوادر اقبال جو ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تو اس میں اس قطعہ کو درج رہنے دیا۔ ناظرین تبرکات اقبال اور نوادر اقبال اس قطعہ کو حضرت اکبر الہ آبادی کا کلام سمجھ کر پڑھیں۔

(محمد بشیر الحق دسنوی)

فتوح الشام و فتوح المصر اُردو نظم میں

کا ایک ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے دونوں نسخے یک جا ہیں۔ فتوح الشام کی تاریخ فرّ عظیم سنہ ۱۳۰۰ھ تحریر ہے اور کتاب کے آخر میں لکھا ہے "بعونہ تعالیٰ تمام شد کتاب فتوحات شام بتاریخ ۳۱ر مئی سنہ ۱۸۸۲ء بتاریخ ۱۲ر رجب ۱۲۹۹ھ بخط بہ منط کلب حسین مصنف ایں نظم"۔

فتوح المصر کی تاریخ فوج الظفر سنہ ۱۳۰۰ھ تحریر ہے۔ دونوں کتابیں اُردو نظم میں ہیں اور تقریباً ۵۰۰ صفحات پر محیط ہیں۔ کلب حسین نے اپنا تخلص اشک لکھا ہے۔ قارئین ہماری زبان سے استدعا ہے کہ اگر کوئی صاحب مصنف کے بارے میں کچھ علم رکھتے ہوں تو براہ کرم ہماری زبان کے توسل سے مطلع فرمائیں، شکریہ۔ (ارشاد فاطمہ حسینی)

انجمن ترقی اُردو کوئٹہ کی مساعی

انجمن ترقی اُردو شاخ کوئٹہ کا نیا انتخاب ۱۵ر جون ۶۳ء کو عمل میں آیا۔ نئے چناؤ کے بعد ہی انجمن ہذا نے گرم جوشی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۶ر جون ۶۳ء کو مجلس عاملہ کا ایک جلسہ طلب کیا گیا اور یکم جولائی سے سرکاری مدارس میں اُردو طلبہ کا داخلہ کرانے کے لئے وارڈ وائز کارکن مقرر کئے گئے جو ارکان کو انجمن نے داخلے کے فارم خرید کر دیے اور ہدایت کی گئی کہ اُردو طلبہ کے فارم خود بھر کر مدرسوں میں بچوں کو داخل کرائیں جس کی وجہ سے کافی طلبہ اس سال کوئٹہ شہر کے اسکولوں میں اُردو کے لئے داخل ہوئے۔

رکاوٹوں کا تدارک کوٹہ جنکشن، مسود اس گھاٹ، پرائمری اور مڈل اسکولوں کی جماعت اوّل اور ششم میں اس سال اُردو جاری کرائی گئی۔ کچھ اسکول کے صدر مدرسوں نے اردو کے داخلے میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کیں اس پر انجمن ہذا کے اراکین وکیل محمد حسین صدر انجمن، پرکاش چند جانہ نائب صدر، اور عبدالرحیم ایڈووکیٹ سکریٹری انجمن مسز جوشی انسپکٹر آف گورنمنٹ اسکولز سے ملے اور اُردو کے داخلے کے لئے احکامات جاری کرائے گئے۔ پاٹن پول مڈل اسکول اور پرائمری اسکول چند گھنٹہ میں پہلی جماعت سے پنجم جماعت تک طلبہ کو اُن کی مادری زبان اردو کے ذریعے تعلیم دیے جانے کے لئے مسز جوشی انسپکٹر آف اسکولز کو ایک میمورنڈم پیش کیا گیا۔ موصوفہ نے ان اسکولوں کے لئے اُردو کے ذریعے تعلیم دیے جانے کا حکم صادر کیا۔ کوٹہ ڈویژن میں باراں انتہ، مانگرول، اٹرو، چھبڑا، بڑود، کھٹولی اور چھبڑا سٹی میں اردو جماعتیں جاری کئے جانے کے احکامات جاری کرائے گئے۔

حکومت کے احکام کی اشاعت گورنمنٹ آف راجستھان کے اُردو کے بارے میں جاری شدہ احکامات کی نقلیں جناب احترام الدین صاحب شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو جے پور سے منگوا کر احکامات کے نمبر اور تاریخ کا حوالہ دے کر ایک اشتہار کی شکل میں عوام میں تقسیم کئے گئے اور شاخوں کو بھجوائے گئے۔ اور ٹیچروں کا اسکولوں میں انتظام نہ ہونے کے سلسلے میں کئی بار عبدالرحیم ایڈووکیٹ سکریٹری انجمن انسپکٹر آف اسکولز سے ملے۔ اس سلسلے میں فی الحال خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی لیکن انسپکٹر آف اسکولز نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ بہت جلد اُردو ٹیچروں کا انتظام کر رہے ہیں۔

کتابوں کی نایابی اس وقت راجستھان کے بہت سے اسکولوں میں اُردو کی تعلیم جاری ہے لیکن اُردو نصاب اور کتابوں کی دقت اب تک حل نہیں ہو سکی۔ حالانکہ کئی مرتبہ احترام الدین صاحب شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو جے پور حکامان بالا سے مل چکے ہیں اور مسلسل کوشش کر رہے ہیں، لیکن اب تک اُردو کتابیں بازار میں دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔

سہ لسانی فارمولا سہ لسانی فارمولے میں کوٹہ کے مقامی گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول رامپورہ نے اُردو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک وفد وکیل محمد حسین صدر انجمن کی قیادت میں ہیڈ ماسٹر بی۔ ایس ویاس مدرسہ ہذا سے ملا۔ تسلی بخش جواب نہ ملنے پر مسز جوشی انسپکٹر آف اسکولز کو ایک میمورنڈم پیش کیا گیا۔ موصوفہ نے مہاتما گاندھی گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول کے ہیڈ مدرس صاحب سے اُردو پڑھنے کی خواہش رکھنے والے طلبہ کی فہرست طلب کی۔ قریب ۶۰ لڑکوں نے سہ لسانی فارمولے میں اُردو پڑھنے کے لئے اپنے نام لکھوائے۔ انسپکٹر آف اسکولز نے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن راجستھان کو منظوری کے لئے کاغذات بھجوا دیئے۔ اس سلسلے میں وکیل عبدالرحیم صاحب سکریٹری انجمن نے جناب شاغل صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو جے پور سے تعاون فرمانے کی درخواست کی کیونکہ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بیکانیر نے فی الحال سنسکرت سہ لسانی فارمولے میں لازمی طور پر پڑھائے جانے کے احکامات صادر کر دیئے ہیں۔ یہ مسئلہ اب تمام راجستھان کا مسئلہ ہے ریاستی سطح پر اس کو حل کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ خدا کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

(محمد حسین ایڈووکیٹ صدر انجمن ترقی اُردو شاخ کوٹہ راجستھان)

آسام کا پہلا مشاعرہ

انجمن ترقی اُردو شاخ آسام کے زیرِ اہتمام آسام کا پہلا تاریخی مشاعرہ گوہاٹی اسٹیٹ لائبریری میں ۱۱ر اگست کی شام کو منعقد ہوا۔ مشاعرے کا افتتاح آسام کے مشہور بزرگ مفکر، ادیب ڈاکٹر بہیاں نے فرمایا۔ صدارت کے فرائض عالی جناب فخر الدین علی احمد وزیر مال آسام نے انجام دیے۔

لائبریری کا ہال اور گیلری مشاعرے کے شائقین سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ اس مشاعرے کے اسٹیج سکریٹری مظہر امام تھے۔ جن شعرائے کرام نے مشاعرے میں شرکت فرمائی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت روش صدیقی، جناب جگن ناتھ آزاد، جناب مظہر امام، حمیدہ سلطان، جناب وفا ملک پوری، جناب ادریس احمد دوراں، جناب جذب آنولوی، جناب ثابت سیدن پوری، جناب خان بہادر عطاء الرحمٰن صاحب (آسام) اس کے علاوہ آسام کے بھی چار شاعروں اور ایک شاعرہ نے اپنا آسامی کلام سُنایا۔ وزیر تعلیم شری دیو کانت بروا، پروفیسر شری لوکانت بروا، ڈاکٹر ہزاریکا کی نظموں اور گیت کو بہت پسند کیا گیا۔ یہ امر خوشی اور حیرت کا ہے جب تھا کہ مشاعرے میں داد اس طرح مل رہی تھی جیسے یہ مشاعرہ شمالی ہندوستان کے کسی حصے میں ہو رہا ہو۔

افتتاح کے بعد صدر استقبالیہ کمیٹی جناب جے۔ ڈی بروا نے شعرائے کرام کو خوش آمدید کہتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اس بات پر بڑی مسرت ہے۔ یوں ہمارے سوشل اور کلچرل تعلقات زیادہ خوشگوار ہوں گے اور ہندوستان کی ایک ہر دل عزیز زبان سے ہماری واقفیت زیادہ ہو گی۔

جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ اُردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان سے باہر بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس کے سمجھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے آسام کی طرف توجہ دی اور یہاں ایک شاخ قائم ہو گئی۔ اس طرح ہمیں میل جول کے موقع اُردو والوں سے زیادہ ملیں گے۔ ہمارے لائق وزیر تعلیم اس شاخ کے صدر ہیں۔ یقین ہے کہ آسام شاخ ان کے زیر سایہ اچھے کام کرے گی۔ وزیر تعلیم نے فرمایا کہ میں اُردو کے گھر دلی میں آٹھ سال رہا ہوں۔ اُردو کے کئی اچھے ادیب اور شاعر میرے دوست ہیں۔ مجھے اُردو سے محبت ہے لیکن چونکہ وہ میری مادری زبان نہیں اس لئے اس میں بلا تکلف آپ لوگوں سے مخاطب نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ مرکزی انجمن نے آسام میں شاخ قائم کی اور مجھے اس کا صدر بننے کا فخر بخشا حالانکہ مجھ جیسے اردو نہ جاننے والے کے لئے اس عہدے کی ذمے داری کو پورا کرنا مشکل ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ کچھ ایسے کام کر سکوں جس سے آسام میں اُردو کی ترقی ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ ہماری پہلی کوشش کامیاب ہوئی اور اُردو سے محبت کرنے والوں سے آسام بھی خالی نہیں ہے۔ یہاں کی شاعرانہ فضا میں ہم لوگ اپنی مادری زبان میں تو شعر کہتے ہیں۔ آج آپ اُردو شعرا کے ساتھ آسامی شعراء کا کلام بھی سنیں گے۔ میں اب زیادہ وقت تقریر میں خراب کرنا نہیں چاہتا۔

اس کے بعد شری دیو کانت بروا نے اپنی نظم ارشاد فرمائی اس کو کافی پسند کیا گیا۔ اس مشاعرے کی یہ انفرادی خوبی تھی کہ پہلے مظہر امام صاحب اُردو کے ہر شاعر کا مختصر لفظوں میں تعارف کراتے تھے اور پھر صدر انجمن شاخ آسام گمچا (آسام کا بنا ہوا ایک ایسا کپڑا جو ڈیڑھ گز لمبا ہوتا ہے اور جس کو پٹکے کی طرح آسام کے مرد کمر میں باندھتے ہیں) شاعر کے شانوں پر ڈالتے تھے۔

مشاعرے کے بعد صدر مشاعرہ جناب فخر الدین علی احمد صاحب نے ارشاد فرمایا خدا کا شکر ہے کہ یہ مشاعرہ بخیر و خوبی انجام پایا، میری دلی خواہش تھی کہ میل جول کی خوشگوار فضا بنانے کے لئے اُردو کو آسام میں متعارف کرایا جائے۔ اُردو کے دامن میں جو بیش بہا خزانے ہیں یقین ہے اس سے اب آسام بھی محروم نہ رہے گا۔ میں ان شعراء حضرات کا مشکور ہوں جو دور دراز کا سفر طے کر کے بغیر کسی معاوضے کے محض اُردو کی خدمت کا جذبہ لے کر یہاں تشریف لائے اور ہمیں اپنی میزبانی کا شرف بخشا۔ اردو محبت کی زبان ہے اور آسام 'کام' اور 'روپ' کا دیس۔ یہاں کے لوگ اردو کے کاموں میں ہر طرح سے امداد کریں گے۔ اس کا یقین آج کے مشاعرے کی کامیابی سے مجھے پورا ہو گیا۔

۱۲ر اگست کی شام کو اسٹیٹ لائبریری شیلانگ کے ہال میں دوسری نشست مشاعرے کی عزت مآب وشنو سہائے صاحب گورنر آسام کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ صاحب صدر نے فرمایا۔ میں آج محفل مشاعرہ شیلانگ میں دیکھ کر بہت مسرور ہوں۔ اور کارکنان انجمن ترقی اُردو شاخ آسام کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اُن کی ان تھک محنت کا نتیجہ خوشگوار نکلا۔ اس ہال کو بھرا ہوا دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہاں کی فضا مشاعرے کے لئے سازگار ہو گی۔

میں تو یو۔ پی کا رہنے والا ہوں میری مادری زبان اُردو ہے حالانکہ میں اُردو میں لکھ پڑھ نہیں سکتا لیکن میرا یہ کہنا غلط نہیں حقیقت ہے کہ شعر و ادب کی گود میں میں نے آنکھ کھولی ہے اور جب تک لکھنؤ و دلی میں رہا، جب بھی موقع ملتا تھا ادبی محفلوں میں

شرکت کرتا تھا۔ آج یہ بہت خوش گوار فرض میرے سپرد اراکین انجمن نے کردیا کہ مشاعرے کی صدارت کروں حالانکہ میں خود کو اس قابل نہیں پاتا۔ لیکن اس خدمت سے انکار بھی کرنا ممکن نہ تھا۔ میں آپ کے اور شاعروں کے بیچ اور زیادہ دیر حائل نہیں ہونا چاہتا۔

مشاعرے کی ابتدا آسام کے ایک بزرگ شاعر خان بہادر عطاء الرحمٰن خاں کی غزل سے ہوئی۔ پھر آسام کے ایک اور اچھے آسامی شاعر ڈاکٹر ہزاریکا نے اپنا دلکش گیت سنا کر محفل کو محظوظ کیا۔ علامہ حضرت جمیل مظہری ناسازیٔ طبع کی وجہ سے خود تشریف نہیں لاسکے تھے لیکن اپنی ایک طویل اور بہت اچھی نظم اردو بھیجی تھی۔ یہ جب مشاعرے میں پڑھی گئی تو حاضرین نے بار بار تالیاں بجاکر اسکی داد دی۔

جگن ناتھ آزاد کی حسین اور دلکش نظم کو بہت پسند کیا گیا۔ وفا ملک پوری کی غزلوں نے خوب رنگ جمایا۔ مظہر امام کا گمبھیر انداز اور دلکش طرز ادا کامیاب رہا اور روشن صدیقی کی مشکل پسندی اور معنی آفرینی نے بھی پُرزور داد پائی۔ ثابت سیدن پوری کی رومانی غزل بھی کشش آفریں ثابت ہوئی۔

مشاعرہ بخیر وخوبی ساڑھے نو بجے رات کو ختم ہوا۔ پھر راج بھون میں شعرائے کرام اور اراکین انتظامیہ کمیٹی کو پُرتکلف ڈنر دیا گیا اور جناب وشنو سہائے صاحب کی توجہ سے رات کے بارہ بجے تک محفل شعر وسخن جمی رہی۔

۱۳ اگست کو تمام شعرا کو قابل دید مقامات کی سیر کرائی گئی اور وزیر تعلیم کی طرف سے دوپہر کو شاندار دعوت دی گئی۔ رات کو جناب فخر الدین علی احمد وزیر مال آسام کی جانب سے ڈنر دیا گیا۔ جس میں شعرائے کرام اراکین انتظامیہ کمیٹی کے علاوہ اعلیٰ افسران فوج، معززین شہر اور گورنر صاحب بھی شامل تھے۔

شعرا کو شیلانگ کے قبائلی کے بنے چھوٹے تحفے بھی شاخ انجمن آسام کی طرف سے پیش کیے گئے۔ اور ۱۴ اگست کو شعرائے کرام کا قافلہ آسام سے بہت خوش مطمئن اور مسرور رخصت ہوا۔

(حسیب الدین احمد جنرل سکریٹری شاخ آسام)

نان پارہ کے اسکول میں سہ لسانی فارمولے کا نفاذ

قومی آواز کی اطلاع ہے کہ نان پارہ بہرائچ میں سہ لسانی فارمولے کے تحت جنتا جونیر ہائی اسکول میں چھٹے درجے میں اردو طلبہ کی تعداد اڑسٹھ ہے جس میں غیر مسلم طلبہ بھی شامل ہیں، اسی طرح سنسکرت طلبہ کی تعداد باون ہے جس میں مسلم طلبہ بھی ہیں جب کہ اس درجے میں کل طلبہ کی تعداد ایک سو بیس ہے۔

یہ فیصلہ طلبہ کے سرپرستوں نے خود کیا ہے اور اس کی اطلاع ہیڈ ماسٹر اسکول ہذا کو دی ہے جنھوں نے چھپے ہوئے فارموں کے ذریعے ان کی رائے مانگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کی تصدیق محکمہ تعلیمات کے ایک سب ڈپٹی انسپکٹر نے بھی کی ہے۔

واضح رہے ضلع میں یہ واحد اسکول ہے جہاں اتنی زیادہ تعداد میں طلبہ کے سرپرستوں نے اردو پڑھانے کی خواہش کی ہے اور جہاں دونوں زبانوں (اردو اور سنسکرت) کے معلم مامور ہیں۔

مرکز ادب گورکھپور کا جلسہ

۱۵ اگست کو یوم آزادی کے موقع پر مرکز ادب گورکھپور کی ایک نشست منعقد ہوئی، جس میں شہر کے ادیبوں شاعروں اور ادب نوازوں نے شرکت کی۔ شری ست کیتو دوبے اسسٹنٹ انفارمیشن افسر بھی خصوصی دعوت پر شریک بزم تھے۔ جناب مقبول احمد انصاری نے اپنا مقالہ "مہاتما گاندھی"، حنیف عارف نے اپنا افسانہ "یادوں کی جھیل"، اور ایم کوٹھیا وی راہی نے اپنا افسانہ "راہیں پرانی رہرو نئے" سنایا۔ شعری دور میں ۲۶ شعرا نے شرکت کی اور اپنی نظموں اور غزلوں سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ محشر بریلوی کی نظم "پندرہ اگست"، عرفی آفاقی کی نظم "شکست نغمہ" اور سعید اختر کی غزل خاص طور سے پسند کی گئیں۔ نشست کا اختتام صدر نشست جناب عبدالرؤف تمنائی کے کلام پر ہوا۔

(احمر لاری، ناظم نشر و اشاعت)

بقیہ

حیدرآباد سے جوش صاحب کی علیحدگی کے حقیقی اسباب

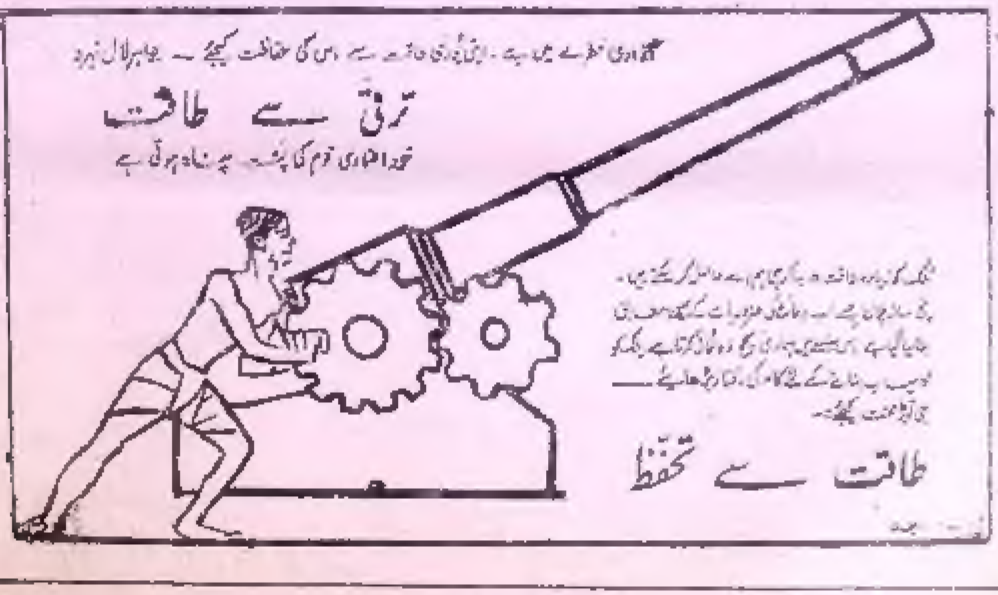
"تو اگر واپس نہ آئی" یا "جنگل کی ساحرہ"، "دیدنی ہے آج وہ ساون کے مہینے" اور اسی کا فرشتہ کی دوسری نظموں میں ہو سکتی ہے، ادھر علی اختر کے ہاں، "نہ مئے دیرینہ" اور بادہ شبانہ کی سرمستیاں ہیں اور "معشوقِ جواں" کا بھرپور اور بے باک جو بن پھوٹ پھوٹ پڑتا ہے۔ وہ تفکر کی طرف زیادہ مائل ہیں اور بعض بعض جگہ تو ان کی نظمیں عارف ہندی کے اس شعر کی ہلکی سی بازگشت ہیں جو دنیا کے تمام غزلیہ اور شبابی شاعری پر محاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مئے دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست
پیشِ صاحب نظراں حورِ جناں چیزے نیست!

دوسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ جس زمانے میں مولانا نیاز فتحپوری نے اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں جوش ملیح آبادی پر تنقید شروع کی، اور ان کے موضوعِ سخن، اسلوبِ بیان، انتخابِ الفاظ اور فنی پہلوؤں کو بقولِ جوش نوکِ خار سے چھونا شروع کیا، تو انھوں نے علی اختر کو جوش کی طرزِ خاص کا موجد ٹھہرایا اور جوش کی ترکیب نوازی مخصوص نشستِ الفاظ، قافیوں اور ردیفوں کی خاص ترتیب علی اختر سے منسوب کی۔ اس افراط و تفریط سے قطع نظر مولانا نیاز کے اس ادعا میں کچھ سچائی بھی ہے علی اختر کی شعری زندگی جوش سے بہت زیادہ کم عمر نہیں۔ ان کی مادی زندگی حیدرآباد میں گزری ہے اور جوش کی شعری زندگی کے عروج کا زمانہ بھی حیدرآباد سے ہی شروع ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے بہت زیادہ اثر و تاثر لینا اس وحدتِ مکان سے ممکن ہے، کسی کے رنگِ سخن کا عین بین چربہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ صاحب طرز شاعر پختہ عمر یا کہنہ مشق ہوں

اور ان کا مقلد نسبتاً جوان ہو۔"

حیرت صاحب کی بیان کردہ کہانی کے تیسرے کردار کی شخصیت بھی آپ کے سامنے واضح ہو گئی۔ اتنی تفصیل میں میں اس لئے گیا کہ "دلوں کا چور" بھی سامنے آجائے۔ علمی و ادبی اختلاف اور مسلک و مشرب کے بُعد کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ لوگ دوسروں کی زندگی کے درپے ہو جائیں۔ جوش صاحب خود اپنے اعمال اور اندھے مداحوں کے کام آگئے ان کے "اخراج حیدرآباد" میں اور کسی کا دخل نہیں۔ حیرت صاحب نے لکھا ہے کہ "پاکستان میں علی اختر سے بھی تعلقات خوش گوار ہو گئے"۔ یہ محض لغویات ہے۔ تعلقات اسی زمانے میں خوش گوار ہو گئے تھے۔ اس دعوے کی سب سے محکم دلیل یہ ہے کہ "کلیم" میں حضرت "اختر مرحوم" کا بھی کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ اور ان کی معروف نظم "اپنے بچے سے آخری باتیں" سب سے پہلے جوش صاحب ہی کے "کلیم" میں شائع ہوئی تھی۔ پھر دوسرے رسائل میں نقل ہوئی یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ اسی زمانے میں السنۂ شرقیہ کے امتحانات کے سلسلے میں میں لاہور گیا تھا اور والد صاحب مرحوم کی ہدایت پر دہلی میں جوش صاحب کی خدمت میں حاضری دے کر گیا تھا اور واپسی پر جوش صاحب کے گھر میں ایک ماہ قیام بھی کیا تھا۔ جوش صاحب اُن دنوں قرول باغ میں فروکش تھے۔ یہیں پہلی بار مجاز مرحوم سے بھی تعارف حاصل ہوا تھا۔ ان دونوں میں خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جوش صاحب نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ "اگر حیدرآباد میرے لئے شجر ممنوعہ نہ ہوتا تو میں صرف تم سے ملنے کے لئے وہاں آتا"۔ بنگلور کے یادگار مشاعرے میں بھی جس میں برصغیر کے سبھی معروف و ممتاز شعراء شریک ہوئے تھے۔ والد صاحب مرحوم صرف جوش صاحب سے ملاقات کی غرض سے شریک ہوئے تھے اور انھیں کے اصرار



اور دعوت پر چند ماہ بعد پونہ جا کر ان کے مہمان بھی رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک "وقتی شکر رنجی" کو اندھے اور اوچھے پرستاران جوش نے ایک سازش قرار دے دیا!

حیرت صاحب نے برسبیل تذکرہ فانی مرحوم کے سامنے جوش صاحب کی زبانی حیدر آباد کو "شاعروں کا قبرستان" کہلوا کر فانی اور جوش کے علاوہ خود حیدر آباد کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس موقع پر اس نام نہاد الزام کی حقیقت کو واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فانی صاحب کا حیدر آباد میں مستقل قیام کے لئے آنے کا زمانہ جوش صاحب کے جل چلاؤ کا زمانہ ہے، اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اس مختصر سی وحدتِ مکانی میں ان دونوں کے تعلقات کچھ زیادہ خوش گوار نہیں رہے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال کی گواہ جوش صاحب کی حسبِ ذیل رباعیاں ہیں جنھیں "جنون و حکمت" میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

احباب کی یہ مزاج دانی افسوس　　یہ کفر بدوش بد گمانی افسوس
جوش اور بنے عدوئے ارباب ادب　　افسوس ہے اے سرشتِ فانی افسوس

دامن کو ہمیشہ نم کیا کرتا ہے　　دریا تری آنکھوں سے بہا کرتا ہے
بنگشت اجل کو جان دینا بہتر　　مرتا ہے بہ اقساط یہ کیا کرتا ہے

اس پس منظر میں تازہ وارد فانی کو حیدر آباد چھوڑ دینے کا مشورہ قرین قیاس نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جوش صاحب نے ایسا مشورہ نہیں دیا ہوگا کیونکہ اس سے خود ان کے بارے میں شبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ حیرت صاحب نے جن مرحوم شعراء کے نام جوش صاحب کی زبانی گنوائے ہیں ان میں داغ و امیر کے ساتھ جلیل کا نام بھی ہے۔ حالانکہ جلیل اس وقت بقید حیات تھے اور اُستادِ شاہ ہونے کی وجہ سے بڑی شان دار زندگی بسر کرتے تھے، داغ کی جتنی زندگی حیدر آباد میں گزری وہ ایسی ٹھاٹ دار اور امیرانہ تھی کہ اس کے تذکرے پڑھ کر لوگ آج بھی رشک کرتے ہیں۔ امیر حیدر آباد آئے اور آتے ہی مرض الموت میں مبتلا ہو گئے اور ایک مہینے کی علالت کے بعد فوت ہو گئے۔ اس سے حیدر آباد کی ادب کشی کس طرح ثابت ہوتی ہے۔ امیر کی وفات کے بعد ان کے اکثر اہل خاندان وہیں رہ پڑے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ شاید حیرت صاحب کو یاد نہیں رہا کہ وہ خود جس محکمہ میں ملازم تھے ایک زمانے میں اس کے ناظم اعلیٰ بھی امیر کے فرزند اختر یار جنگ اختر مینائی مرحوم رہے تھے!

حیرت صاحب نے جوش صاحب کی زبانی حیدر آباد کو "شاعروں کا قبرستان" ٹھہرایا۔ لیکن خود جوش صاحب حیدر آباد کے متعلق کیا فرماتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔ پولیس ایکشن کے دو چار سال بعد جوش صاحب حیدر آباد گئے اور اس کے متعلق نظم کہہ کر وہاں کی محفلوں میں سُنائی۔ یہ نظم طویل ہے اور شائع بھی ہو چکی ہے۔ چند شعر اپنے موضوع کے متعلق پیش کرتا ہوں:

حیدر آباد اے نگارِ گل بداماں السلام
السلام اے قصۂ ماضی کے عنواں السلام
تو نے کی تھی روشنی میری اندھیری رات میں
مہر و مہ خوابیدہ ہیں اب بھی ترے ذرات میں
میرے قصرِ زندگی پر اے دیارِ محترم
تو نے ہی کھولا تھا ذوقِ علم کا زریں علم
تو نے ہی بندے کو بخشی تھی کلیدِ اسرار کی
تو نے ہی زلفیں سنواری تھیں مرے افکار کی

اسی نظم کے ایک شعر کا یہ مصرع "شہر کا محبوب ہوں در شاہ کا معتوب ہوں" حیرت صاحب کے اس ادعا کی بھی تکذیب کر رہا ہے کہ پولیس ایکشن کے بعد جب وہ حیدر آباد گئے تو کنگ کوٹھی جا کر نظام سے بھی ملے تھے۔ حیرت صاحب نے لکھا ہے کہ "فانی نے جوش کی زبانی اور اپنے اس شعر پر عمل کیا۔"

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

فانی کی ایک پُرانی غزل کے اس مقطع کو حیدر آباد کے حالات کے پس منظر میں اس مقام پر چسپاں کرنا بھی بڑی جسارت کا کام ہے۔ فانی کا زیر بحث مقطع جس غزل کا ہے وہ "باقیات" میں شامل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ "باقیات" ۱۹۳۲ء میں آگرے سے شائع ہوئی تھی اور اس زمانے میں فانی صاحب کا قیام بھی آگرے ہی میں تھا اور "باقیات" کی اشاعت کے بعد ہی فانی صاحب حیدر آباد میں مستقل قیام کے لئے آئے تھے۔ فانی مرحوم اور حیدر آباد ایک مستقل موضوع ہے اس پر کسی آئندہ صحبت میں روشنی ڈالی جائے گی۔

سرشار کسمنڈوی کا انتقال

اُردو کے شاعر و صحافی سرشار کسمنڈوی دو تین سال سے کینسر کے نامراد مرض میں مبتلا تھے افسوس کہ گزشتہ مہینے لکھنؤ میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

آئینۂ سخن فہمی

از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتا۔ کتاب نگر۔ دین دیال روڈ، لکھنؤ۔

پروفیسر سید مسعود حسن کی کتاب "ہماری شاعری" اردو تنقید کے موجودہ سرمائے میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ایک زمانے میں جناب نجود موہانی نے جو ایک اچھے شاعر اور ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی رایوں کے اظہار میں ایک گونہ شدت اور بے اعتدالی سے کام لیتے تھے، کتاب مذکور پر اعتراضات کئے تھے جو جوہر آئینہ اور منظر آئینہ کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ ان کے جواب میں پروفیسر صاحب نے متعدد مضامین لکھے تھے جن میں سے اکثر ملک کے موقر رسائل میں نکلے تھے۔ اب یہی مضامین کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں ہنگامی مباحث اور لفظی ردّ و قدح سے قطع نظر، شاعری سے متعلق بہت سی کام کی باتیں ملتی ہیں جو نہایت شستہ و شائستہ انداز اور مفصل و مدلل پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص پروفیسر موصوف کی بعض رایوں سے اختلاف کرے لیکن ان کی سخن فہمی میں شبہہ نہیں کرسکتا۔ ہمیں امید ہے کہ آئینۂ سخن فہمی اپنی افادیت کے پیش نظر، اہل ذوق کے حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

آفتاب ہجویر

مصنفہ پیام شاہجہاں پوری

یہ کتاب ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز، کشمیری بازار لاہور (۸) نے شائع کی ہے اور دو روپے قیمت رکھی ہے۔

جن بزرگوں اور صوفیوں نے شروع شروع میں یعنی حضرت خواجہ اجمیریؒ کی آمد سے پیشتر ارض ہند کو اپنے فیوض و انوار کا مرکز بنایا اور یہاں رہ کر حق و صداقت کا پرچار کیا، ان میں مخدوم علی بن عثمان ہجویری معروف بہ داتا گنج بخشؒ کی ذات امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی مشہور و معروف کتاب کشف المحجوب فارسی میں تصوف کی سب سے پہلی تصنیف کہی جاتی ہے۔ آپ کا وطن غزنین ہے۔ اور اسی کے دو قریوں ہجویر اور جلاب کی نسبت سے آپ ہجویری جلابی کہلاتے ہیں۔ "آفتاب ہجویر" کے مصنف نے اس کتاب کو تین ابواب پر منقسم کیا ہے۔ پہلا سوانح، دوسرا ورود لاہور اور تیسرا آپ کے افکار و نظریات پر مشتمل ہے۔ ساتھ ہی آپ کی تصنیف پر تبصرہ۔ صوفی اور تصوف کی تعریف۔ صوفیہ کے مختلف فرقوں کا ذکر اور تصوف کی اصطلاحات وغیرہ بھی آگئی ہیں جو دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔ مگر چونکہ خیالات دقیق اور "مستعملہ نسخے اغلاط سے لبریز" اس لئے بعض جگہ ترجمہ اور تشریح میں لغزش ہو گئی ہے۔ مثلاً ابو علی ابو الفضل بن محمد لغاری کو شیخ ابو القاسم بن علی بن عبد اللہ الگرگانی کا فرزند لکھا ہے۔ حالانکہ وہاں "خلف" سے فرزند نہیں، صرف جانشین مراد ہے (ص ۲۱)۔ علیٰ ہذا ص ۲۲ پر شیخ کا جو جواب درج ہے اس میں بھی ترجمے کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ص ۴۴ پر ہے کہ "فنا کی صحت کا قوائے اصل یہی ہے"۔ حالانکہ "فنا کی صحت پر اصل قول یہی ہے" ہونا چاہئے۔ ص ۷۰ پر مخدوم ہجویری کی ایک تصنیف کا نام "اسرار الخرق والمؤنیات" تحریر کیا ہے۔ اور ص ۷۲ پر دوسری کو "بالرعایت بحقوق اللہ" لکھا ہے، جب کہ "اسرار الخرق والمؤنات" اور "الرعایۃ لحقوق اللہ" صحیح ہے۔ قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کا "تخلیق کردہ" کہنا (ص ۱۰۷)۔ یا الصفۃ کی یہ تعریف کرنا کہ ایسی حقیقت جو قائم بالذات ہو اور کسی تغیر سے اثر پذیر نہ ہو (ص ۱۱۳) بھی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان اغلاط کی تصحیح کر دی جائے گی۔

سہ لسانی کنونشن کے لئے تیاری کمیٹی کی تشکیل

لکھنؤ ۹ اگست۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت اتر پردیش کے تمام اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا لازمی انتظام جب تک نہ ہو سہ لسانی فارمولے کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ فیصلہ لکھنؤ اور قریبی اضلاع کے سرکردہ اصحاب نے ایک اجتماع میں کیا جو رائل ہوٹل لکھنؤ میں، ریاستی جمعیۃ علماء اور دینی تعلیمی بورڈ کی دعوت پر کل اتوار کو ہوا۔ جلسے کی صدارت بیگم اعزاز رسول ایم ایل سی نے کی۔

جلسے نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ مذکورہ مطالبے کو موثر طریقے پر پیش کرنے کے لئے اتر پردیش کے ہمدردان اردو کا لکھنؤ میں ایک کنونشن آئندہ ماہ طلب کیا جائے۔ کنونشن کی صدارت کیلئے پنڈت آنند نرائن ملا صاحب سے درخواست کرنا طے کیا گیا۔

کنونشن کی تیاری اور ابتدائی انتظامات کے لئے ایک تیاری کمیٹی منتخب کی گئی جو پروفیسر مسعود حسن رضوی، مسٹر رمیش سنہا سابق ایڈیٹر ہندی "جن یگ"، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، مسٹر امین سلونوی، سید محمد امین، مسٹر برج موہن ناتھ کاچرو ایڈوکیٹ، مولانا عظمت اللہ، مسٹر مختار احمد قدوائی ایم۔ ایل۔ سی، ڈاکٹر رغیب حسین اور مسٹر اسحاق سنبھلی ایم۔ ایل۔ سی (کنوینر) پر مشتمل ہے۔

(قومی آواز لکھنؤ)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپواکر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند سے شائع کیا